ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ

قانون اسلامی میں سزائیں اور اجتماعی رجحانات

ترجمہ: مولانا حبیب ریحان ندوی

جہاد کے سلسلے میں اس طریقے سے اظہار نے اور اپنی جان کو اللہ کے لیے خرچ کر دینے کے مطالبے نے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص اثر پیدا کیا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے احد کے دن پوچھنے لگا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو کہاں جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا، جنت میں۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں تک پھینک دیں جو کھا رہا تھا اور قتال میں مشغول ہو گیا تا آنکہ شہید ہو گیا۔

میں اس سلسلہ کی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً سود کا حرام ہونا، طلاق کا قانون، میراث کا مسئلہ، گواہی کا نہ چھپانا وغیرہ۔ لیکن اختصار کی وجہ سے انھیں پر اکتفا کرتا ہوں کہ قانون اسلامی کی خصوصیت انھیں سے نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس اسلامی قانون کے علاوہ کسی بھی وضعی قانون میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ تمام قانون ساز ایک وضاحتی نوٹ لکھتے ہیں جس میں قانون بنانے کے اسباب اور جو طریقے اس میں استعمال کیے گئے ہ، بیان کرتے ہیں۔ نیز قانون کی غرض بیان کی جاتی ہے لیکن اس تمہیدی وضاحتی نوٹ اور اسلام کے تمہیدی ترغیبی طریقوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام ان میں منفرد ہے۔ ان کو بڑھ کر مخاطب تسلیم کر لیتا ہے کہ قانون اسلامی میں عدل و عدالت دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اللہ کی رضامندی و قبولیت ان قوانین کے ساتھ ہے، اور دنیا و آخرت کی کامرانی بھی اسی پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ اس سب کے بعد کونسی ایسی چیز باقی رہ جاتی ہے

جو قانون شکنی پر آمادہ کرے۔

اسلامی قانون میں سزا دنیاوی واخروی ہے

کھلی بات ہے کہ قانون ان چند قواعد کا نام ہے جو اجتماعی تعلقات وروابط کو جوڑتے ہیں اور جن کے ذریعہ رعایا کے تمام حقوق کی نگہبانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی معلوم ہے کہ تمام وضعی قوانین کی سزائیں ہمیشہ صرف دنیاوی ہی ہو سکتی ہیں کیونکہ قانون ساز کے اختیار میں دنیا کے علاوہ آخرت کا کچھ حصہ بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے جو شخص دنیا میں قانون کی نظر سے بچ گیا وہ اپنی سزا پانے سے بچا رہا۔

لیکن آسمانی قانون جس کی سب سے اعلیٰ شکل اسلامی قانون ہے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں سزا دیتا ہے اور ہمیشہ آخرت کی سزا دنیا سے زیادہ ہوتی ہے اور اس وجہ سے مسلمان دل کے جذبے اور اندرونی خواہش کے مطابق خود بخود احکام الٰہی کی اطاعت کرنے کا خواہاں اور قانون شکنی سے باز رہے اور اندھیرے اجالے سب جگہ آخرت کے عذاب کے ڈر سے گناہ سے بھاگتا ہے۔ واضح بات ہے کہ جو قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے بنایا گیا ہو اس کی یہی شان ہونی بھی چاہیے۔

اسلام فرد و معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی مثال اور پاک سوسائٹی کو جنم دینا چاہتا ہے جس میں دین و اخلاق کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھنے پائے، ایک ہاتھ بھی نہ بڑھنے پائے، ایک پلک بھی نہ جھپکنے پائے، اور اسی بنیاد پر قانون اسلامی کسی بے راہی اور بد اخلاقی کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا۔

اسلام نے صرف پاک سوسائٹی بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ فرد و معاشرہ دونوں کی سعادت و کامیابی کی فکر صرف اس دنیا میں بھی کی اور اسی لیے انسان کو انسان کے حقوق سے آگاہ کیا اور حقوق العباد کو حقوق اللہ کے برابر کا درجہ دیا۔

قانون اسلامی کا اجتماعی رجحان

اسلامی قانون فرد و معاشرہ دونوں کی اصلاح کرتا ہے۔ لیکن اس کے تمام رجحان اجتماعی ہیں۔ ہم نے اشتراکی کا لفظ جان بوجھ کر اس لیے استعمال نہیں کیا کہ اس لفظ کے معنی اقتصاد کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔ اجتماعی رجحان سے مراد وسیع معنی ہیں جن میں تمام حقوق و واجبات کے ساتھ مال کا عنصر بھی آجاتا ہے۔

اس قانون کا اجتماعی رجحان ہر جگہ صاف نظر آتا ہے۔ عبادات جس میں اللہ کا تعلق بندے سے ہے یا معاملات جن میں بندوں کا تعلق بندوں سے ہے، ان دونوں صورتوں میں شریعت اسلامیہ فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اصلاح پر بھی پورا زور دیتی ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی شرعی حکمت، تجارت کا جواز، سود کی حرمت، پڑوسی کے حقوق، وفائے عہد، شادی کا جواز، زنا کی ممانعت، گناہوں پر حدود شرعیہ کا قیام وغیرہ ان سب میں قانون اسلامی کا اجتماعی رجحان غالب ہے اور سوسائٹی میں فساد و بداخلاقی کو ہر قیمت پر رد کرتا ہے۔

مثال کے طور پر شوہر کے حقوق میں سے یہ ہے کہ بیوی اس کی اطاعت کرے تاکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعث سکون ہوں۔ گھر جنّت کا نمونہ ہو۔ لیکن اس حق کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح مقید کر دیا کہ عورت کو نقصان یا تکلیف نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو قاضی اس حق کو ختم کر دے گا اور حق تلفی کی سزا بھی دے گا، اور نقصان و تکلیف کے احوال میں عورت کو اس بات کا حق دیا ہے کہ طلاق لے سکتی ہے۔

گو آیت طلاق رجعی کی صورت میں ہے لیکن اس آیت میں بیان کیا ہوا قاعدہ پوری ازدواجی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔ مثال کے طور پر رعایا کا حق یہ ہے کہ وہ حاکم کی اطاعت کریں لیکن حاکم کو مطلق العنان نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے

کرے بلکہ اطاعت کی شرط یہ ہے کہ حاکم امت و وطن کی مصلحت کے لیے کام کرے۔
حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب واكره مالم يؤمر
بمعصية فان امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔

سننا اور اطاعت کرنا ہر محبوب و مکروہ چیز میں ہے جب تک اس کو گناہ کا
حکم نہ دیا جائے لیکن اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر سمع و طاعت نہیں۔

اسی طرح حضرت ابو عبیدہ بن الجراح سے روایت ہے کہ گاؤں کے کسی آدمی نے ان سے امت کے مال میں سے کچھ مانگا۔ انھوں نے فرمایا میں ہرگز اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک کہ شہر والوں کو نہ دوں۔ پس جس کو جنت کی خوشبو سونگھنی ہے اس کو جماعت سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہیے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان یزید بن حصین کے نام ہے کہ فوج کو فرائض خداوندی کی ادائیگی کا حکم دو اور گاؤں والوں کی فکر سے زیادہ شہر والوں کی فکر و خیال کرو کیونکہ وہ نہ مسلمانوں کے اجتماعوں میں حاضر ہوتے ہیں نہ ان کی عیدوں کو دیکھتے ہیں۔

اسی طرح امام ابو یوسف کتاب الخراج میں رقمطراز ہیں کہ جس وقت عراق و شام فتح ہوا تو صحابہ کے ایک بڑے گروہ کی رائے تھی کہ زمین کو فاتحوں کے اندر تقسیم کر دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے زمین کو اس کے مالکوں ہی کے قبضے میں دے کر ان سے جزیہ و خراج وصول کیا اور اس طرح عام مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کو شخصی مصالح پر ترجیح دی اور یہ حضرت عمرؓ کی رائے ان صحیح رایوں میں سے تھی جن کی توفیق اللہ تعالیٰ ان کو اکثر اوقات دیا کرتا تھا۔

اسی طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ مالک کو اپنی ملک پر پورا تصرف و اختیار ہے اگر وہ چاہے تو اس کو فروخت کر سکتا ہے جس طرح خریدنے والے کو پورا اختیار ہے کہ وہ جو

چاہے خرید سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اجتماعی فوائد و مصالح کی بنا پر شریعت نے پڑوسی کے لیے حق شفعہ کا قانون بنایا اور اس کو یہ حق دیا کہ وہ قانون کے زور سے ایسی خرید و فروخت کو لغو کرا سکتا ہے اور خود خرید سکتا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اسلامی قانون کسی دوسرے کو بلا وجہ نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

شریعت اسلامیہ ہر حق والے کے حق کا اعتراف کرتی ہے اور اس کی حفاظت بھی اور اس کو اس بات میں آزاد بھی چھوڑتی ہے کہ وہ اپنی ملک میں تصرف کرے لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ اگر حق والا اپنے حق کو استعمال کرے تو کسی دوسرے کا اس سے نقصان نہ ہو اور یہ اس وجہ سے کہ اسلامی قانون معاملات کی اصل "لاضرر ولا ضرار" (نہ نقصان دینا اور نہ نقصان اٹھانا) ہے۔ اس لیے بعض اوقات بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور اس قاعدے کی رو سے دونوں کا فائدہ ہوتا ہے اور یہی اسلامی قانون کا وہ اجتماعی ذہن ہے جس نے اس کو ہمیشہ کے لیے معاشرہ کی فلاح و بہبود کا ضامن بنا دیا۔

اس قاعدہ کی عملی شکل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے کھیت میں پانی پہنچنے کا طریقہ صرف یہ ہو کہ کسی دوسرے کی زمین میں سے پانی گذرنا ناگزیر ہو تو شریعت اسلامیہ قانون کے زور سے اس شخص کے کھیت میں پانی پہنچائے گی۔

یحییٰ بن آدم القرشی کا بیان ہے کہ ضحاک بن خلیفہ الانصاری کی زمین میں پانی صرف اس صورت میں پہنچ سکتا تھا کہ محمد بن مسلمہ کے باغ میں سے ہو کر گذرے۔ محمد نے اپنے باغ میں سے پانی گذرنے کی اجازت نہ دی۔ ضحاک حضرت عمر فاروق رضی کے پاس آئے اپنی مشکل کی گرہ کشائی چاہی۔ آپ نے محمد بن مسلمہ سے پوچھا کہ اس میں تمہارا کچھ نقصان ہے؟ انھوں نے کہا کچھ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم اگر پانی پہنچنے کے لیے تمھارے پیٹ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ ہوتا تو میں اس پر سے پانی گذارتا۔ پھر آپ نے حکم نافذ کیا اور پانی پہنچوایا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ سے یہ کہا کہ اس میں تمہارا فائدہ ہی ہے۔ پہلے اس پانی سے تمہیں سیراب ہوگے اور بعد کو بھی تم ہی۔

مثال کے طور پر ہم نے چند باتیں لکھیں ورنہ اجتماعی رجحان کے سلسلہ میں قرآن وسنت اور صحابہ کے عمل نیز فقہا کے احکام میں سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

جہاں تک انسانی قانونوں کا تعلق ہے تو پہلے پہل ان قوانین نے اجتماعی نظریے کی طرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ صرف شخصی اور ذاتی محدود نفع پر قانون کی فلک بوس عمارت قائم کی۔ مثال کے طور پر فرانس کا مدنی قانون جو ۱۸۰۴ء میں صادر ہوا، یہ قانون فرانسیسی انقلاب کا رہین منت تھا جس کے نظریات ومقاصد یہ تھے کہ قیود میں جکڑے ہوئے فرد کو آزاد کیا جائے اور سیاسی، اقتصادی وقانونی اعتبار سے اس کو حق خود اختیاری دیا جائے۔ ۱۷۸۹ء میں ہونے والے انقلاب فرانس نے یہ بات مقرر کردی کہ انسان شخصی اعتبار سے کچھ طبعی وفطری حقوق رکھتا ہے اور وہ اتنے مقدس وبلند ہیں کہ ان کو ٹھکرانا یا ان کی توہین کرنا کسی صورت میں ناقابل برداشت ہے اگرچہ اس سے دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

اسی وجہ سے اس قانون میں ایک شخصی اور فردی روح پھیل گئی اور یہ ان کے اس نظریے کے موافق تھی کہ انھوں نے انسانی جماعت سے الگ ہو کر یہ کہا کہ انسان کائنات کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ ایک ایسا وقت آیا جب انسانی حقوق مطلق العنان ہوگئے اور حق والے نے اپنے حق کے استعمال میں اس آزادی وبے باکی سے کام لیا کہ دوسروں کے زبردست سے زبردست نقصان کی مطلق فکر نہ کی۔

کیونکہ حقوق کی یہ مطلق العنانی اور قانون کی بے بسی غیر فطری بات تھی اس لیے زیادہ دن تک یہ بات نہ چل سکی اور زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس قانون میں بھی تبدیلی کی گئی اور یہ ثابت کیا گیا کہ انسان کے فردی اعتبار سے جو حقوق ہیں وہ مسلّم ہیں لیکن وہ انسانی برادری کے ایک فرد

کی حیثیت سے ہے اس سے الگ نہیں ہے اور اس کے بعد قانون نے حق والے کو اپنے حقوق استعمال کرنے کی ایک حد متعین کر دی اور "حقوق کو غلط استعمال کرنے کا نظریہ" قائم ہوا۔

لیکن ان نئے قوانین کے باوجود یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام نے فرد کے حقوق میں جو حدود و قیود لگائی ہیں ان کے ذریعہ فرد جماعت دونوں کا نقصان نہیں ہوتا وہ زیادہ وسیع پیمانہ پر اور زیادہ نفع بخش ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تمام قوانین سود کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ اس میں کھلے طور پر سرمایہ دار کے لیے شخصی فائدہ ہے۔ لیکن محتاج قوم کے افراد کے لیے جماعتی طور پر سخت نقصان ہے۔

ہماری رائے میں خداوندی قانون اور انسانی قانون میں یہ واضح فرق اس لیے بھی ہے کہ دونوں کے درمیان انسانی حقوق اور آزادی کے بارے میں بنیادی اختلاف ہے۔ انسانی قانون یہ سمجھتا ہے کہ فرد کے حقوق طبعی ہیں وہ ان کا مالک ہے جس طرح اس کا جی چاہے ان کو خرچ کرے اور غلط استعمال کرنے پر بھی وہ گنہ گار نہیں۔ لیکن اسلامی قانون کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ فرد بحیثیت انسان ہونے کے خود اور اس کی تمام ملکیت اس کی ملکیت نہیں بلکہ وہ سب خدا کی ملک ہے اور وہ خدا کے احکام کا بندہ ہے اور خدا نے ان حقوق کو استعمال کرنے کے لیے جو کچھ بھی حریت و اختیار بخشا ہے وہ صرف اس مقدس غرض کے لیے ہے کہ فرد و معاشرہ دونوں پاک رہیں اور اجتماعی زندگی زیادہ سے زیادہ بہتر ہو اس وجہ سے اسلام نے فرد کے حقوق میں جگہ جگہ قیود و حدود مقرر کیے ہیں۔

یہ بات کسی کے نزدیک بھی اختلافی نہیں کہ قوانین انسانوں کی دنیوی و اخروی مصالح کے لیے آئے ہیں اور اسلامی قانون ایک ایک جزو میں استقرائی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فقہاء اس پر متفق ہیں اور اس کا عقلی و منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں اور اپنے حقوق کے استعمال میں بے باک نہ ہو بلکہ ان کو اس طرح ادا کرے کہ شریعت کے مقاصد کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ ایک باطل کام تصور کیا جائے گا کیونکہ وہ روح قانون کے منافی ہوگا۔

تطور کی صلاحیت

ہر قانون کی طبیعت اور اصول میں سے یہ ہونا چاہیے کہ زمانوں اور مقامات کے لحاظ سے اپنے اندر تطور کی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ وہ انسانی تغیر پذیر زندگی کے لیے موزوں ہو ورنہ اس قانون کو مردہ تصور کیا جائے گا۔

فقہ اسلامی کے اندر تطوّر کی کامل صلاحیت موجود ہے اور وہ زمانے کے تغیرات اور حوادث کا پورا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس کی ابتدا خلفائے راشدین کے زمانے سے ہو چکی تھی اور اگر کہیں فقہاء امت قرون وسطیٰ میں واقعی طور پر مسائل کے استنباط اور نئے احکام کو زمانہ کے مطابق ڈھالنے میں مصروف رہتے اور پرانے مسائل پر جمود نہ کیا ہوتا تو آج امت اسلامیہ کو مطلق کسی دوسرے مغربی قانون کی ضرورت پیش نہ آتی۔

افسوس کی بات ہے کہ ہم نے تمام چیزیں مغرب سے لینی شروع کر دیں گویا کہ ہم ایک ایسی بے سرمایہ قوم ہیں کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں، بہرحال اب مسلمان کچھ جاگ رہے ہیں اور انشاء اللہ خدا کے فضل سے ایسی صبح پر نور ضرور طلوع ہوگی جس میں ہم قانون اسلامی کو صحیح طریقے پر مرتب کریں گے اور اس کو اپنا قانون بنائیں گے۔

تطور کے وسائل کئی ہیں جن میں سے اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، چند شروط کے ساتھ عرف کی رعایت وغیرہ۔